R. No. 2186/57 | Regd. No. L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷، شمارہ ۱۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

تعمیری کاموں کا طریقہ

اس وقت اردو دوستوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ تعمیری کاموں کی طرف پوری توجہ کریں۔ حکومت سے وہ سہولتیں طلب کرنا جو دستور نے ہمیں دی ہیں اپنی جگہ اہم ہے، مگر کافی نہیں ہے۔ اوّل تو حکومت کے اپنے احکام کاغذ پر زیادہ رہتے ہیں عمل میں کم آتے ہیں، دوسرے موجودہ سیاست کی فضا میں ہر سیاسی پارٹی قومی مسائل کو بھی پارٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی ہے۔ اس لیے اردو کے سوال کو بھی جو ایک قومی سوال ہے، فٹ بال بنا لیا گیا ہے۔ جو پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی ہے وہ ٹال مٹول کرتی ہے، جب مخالفت میں ہوتی ہے تو اپنی ساکھ بڑھانے کے لیے پرزور حمایت کے دعوے کرتی ہے۔ اس لیے اردو دوستوں کو سیاسی میدان کے علاوہ، دوسرے میدانوں کی طرف بھی دیکھنا ہے۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اردو کی تعلیم کا ابتدائی اور ثانوی درجے پر قابلِ اطمینان انتظام ہو۔ اس انتظام کے بعد اعلیٰ تعلیم کا درجہ آتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی ضمانت دستور میں دی گئی ہے مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ریاستی حکومتیں اور ضلع کے کرتا دھرتا اس معاملے میں بڑی سستی سے کام لیتے ہیں اور بہت چیخ پکار کے بعد ایک دو جگہ انتظام کر دیتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مردم شماری کے اعداد دیکھ کر حکومت خود ان علاقوں میں جہاں اردو دوستوں کی خاصی آبادی ہے، ابتدائی اور ثانوی اسکول کھول دیتی اور جہاں دس ابتدائی اسکول ہوتے وہاں ایک ثانوی اسکول بھی ہوتا۔ اس کے ساتھ اساتذہ کی تربیت اور مناسب کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ ہماری شاخوں کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اپنے حلقے میں حکومت کو اسکول کھولنے پر مجبور کریں۔ مگر اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی نہ رہیں کہ حکومت کب اسکول کھولتی ہے، بلکہ مقامی حضرات کی مدد سے اپنے اسکول بھی کھولیں۔ اپنے اسکول کھولنے اور چلانے کے اخراجات مقامی وسائل سے پورے کیے جا سکتے ہیں اور دستور کی ہدایت کے مطابق ان اسکولوں کو حکومت سے امداد بھی ملے گی۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اصولی باتوں پر لوگ کم کان دھرتے ہیں، ہاں ذاتی کوشش اور اثر سے بڑے بڑے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ اس لیے اردو دوست اپنے حلقے کے اچھے اور متمول لوگوں کی مدد سے اردو کے اسکول قائم کر سکتے ہیں اور ان کے لیے وسائل بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ایوب مرحوم نے جو اس زمانے میں بہار کی ریاستی شاخ کے صدر تھے انجمن کے اپنے اسکول کھولنے کی ایک اسکیم بنائی تھی۔ اس اسکیم پر بہار کے اردو دوستوں کو جلد سے جلد عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح اتر پردیش میں بھی ریاستی شاخ کو اپنے اسکول کھولنے چاہئیں۔ اپنے اسکول کھولنے سے کئی فائدے ہوں گے۔ طلبہ کی بنیادی ضرورت پوری ہوگی۔ تعمیری کام کا تجربہ ہوگا جس کی وجہ سے دوسرے کاموں میں مدد ملے گی۔ اردو دوستوں میں اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوگا اور وہ دوسروں کا منہ دیکھنے کی عادت ترک کر دیں گے۔ ہاں ان اسکولوں میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھنا ہوگا کہ تعلیم کا معیار ہر طرح بلند ہو۔ اردو دوستوں کو نہ صرف صحیح بنیادوں پر علم سیکھنا ہے، انھیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے مقابلہ بھی کرنا ہے تاکہ زندگی کی دوڑ میں وہ کسی طرح پیچھے نہ رہ جائیں۔ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ اردو کے علاوہ ہمارے طلبہ کو علاقائی زبان اور انگریزی اچھی طرح آتی ہو۔ علاقائی زبان سے بیگانہ رہنا، روزمرہ کاموں میں دشواری پیدا کرے گا اور انگریزی میں خامی، عالمی معیاروں سے کٹ جانے کے مترادف ہوگی۔

آج اردو دوستوں میں جو غم و غصہ ہے، وہ قدرتی ہے۔ بیس سال سے ہمارے حقوق پامال ہو رہے ہیں اور ہمیں عام طور پر عدل سے بہلایا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم غم و غصہ کے عالم میں کوئی غلط اقدام نہ کریں۔ ہمیں سب سے پہلے اپنے عقیدے پر قائم رہنا ہے کہ ہر حال میں ہم اردو زبان کی حفاظت کریں گے اور اس کی ترقی کے لیے راہیں نکالیں گے۔ پھر اس مقصد کے لیے روپیہ، وقت، کارکن مہیا کرنے ہیں، تاکہ ہماری مہم جاری رہ سکے۔ پھر سب سے پہلے خود کچھ کرنا ہے، پھر دوسروں سے کرانا ہے۔ اس تعمیری نقطۂ نظر کی آج جتنی ضرورت

سے پہلے کبھی نہ تھی۔ امید ہے کہ اردو دوست اس معاملے میں اپنی فکری بحث اور عمل کی صلاحیت کا پورا ثبوت دیں گے۔

گوا سے ایک اردو ہفتہ وار کا اجرا

پناجی، گوا سے عنقریب ایک اردو ہفتہ وار "صوت" کے نام سے جاری ہوگا۔ یہ اخبار پناجی سے جناب اشرف آغا داؤدی کی ادارت میں شائع ہوگا۔ یہ اخبار قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نقیب ہوگا اور اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرتا رہے گا۔

مسعود علی ذوقی کو اعزاز

علی گڑھ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ جناب مسعود علی ذوقی کو جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہو گئے ہیں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سبکدوش اساتذہ کی امداد اسکیم کے تحت چھ ہزار سالانہ کا اعزازیہ اپنے علمی کاموں کو جاری رکھنے کے لئے دیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک ہزار سالانہ مزید اخراجات کے لیے دیئے جائیں گے۔ یہ اعزاز اس سے قبل بھی اردو کے مشاہیر کو مل چکا ہے۔ جناب مسعود علی ذوقی شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی کام کریں گے اور تدریس میں بھی ان کی شرکت ہوگی۔ (نامہ نگار)

رشید احمد حسین ریحانی

آج کا انساں

کس سے کہیں اے گردشِ دوراں　　کیا ہے یہ آج کا انساں
دل کی صدا ہے شیطاں شیطاں　　اور زباں پر یزداں یزداں
گرمئ نفرت شعلہ شعلہ　　جوششِ عداوت طوفاں طوفاں
روحِ سخن ہے دل آزاری　　حرفِ محبت زینتِ عنواں
ہر لب پر ہے نفسی نفسی　　زلیت کی محفل حشر کا میداں
اپنے قلم سے تونے فطرت　　خوب بنایا نقشِ انساں
جیب تنگ دل ہے دامن خالی　　جینا اور مرنا ہے یکساں
قدرت کا منشا ہے محبت　　کوئی زباں بھی بولے انساں
ایسا گلشن مل کے بنائیں　　جھوم کے آئے فصلِ بہاراں
دیکھ کے جس کو اے ریحانی
خالق بھی ہو جائے حیراں

اردو کی کتابوں پر انعام

نئی دہلی ۱۰ مارچ۔ مرکزی وزارت تعلیم نے نوخواندوں کے لیے اٹھارہ کتابوں اور مسودوں کا انتخاب کیا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا ہے۔ چار کتابیں ہندی کی دو دو آسامی، گجراتی، تامل اور اردو کی اور ایک ایک بنگلہ، کشمیری، ملیالم، اڑیہ، پنجابی، اور تلگو کی ہیں۔ اردو کی منتخب کتابوں اور مصنفوں کے نام یہ ہیں۔

سائنس کے راستہ پر بھیا۔ مسرور، قومی پرچم۔ ابراہیم فکری (سیاست)

ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کا لغت

پراگ، یہاں کے اکیڈمی اشاعت گھر نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان ہے "ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کا لغت" یہ لغت اپنی نوعیت کا واحد نمونہ ہے اور اس دو جلدی کتاب میں ادیبوں کے بارے میں تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ (افکار)

طلاکار کتابت

گنگٹوک ۱۰ مارچ۔ جاتا بدھ کی کتابوں کو بھوٹان میں سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ اس مقصد سے ۹۰ کلرکوں کو ملازم رکھا گیا اور ۱۰ من سونا چھپا کیا گیا۔ اس مقصد سے بھوٹان میں خاص قسم کا کاغذ تیار کیا گیا۔ یہ اس مہم کا ایک حصہ ہے جو جاتا بدھ کی دو سو کتابوں کو سنہری حروف میں لکھنے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ بھوٹان کے حکمراں دیلی ننگا وانگ نتر گنگ نے اٹھارھویں صدی میں ان کتابوں کو طلائی حروف میں لکھوایا تھا مگر جس لائبریری میں یہ کتابیں رکھی ہوئی تھیں اسے آگ لگ گئی اور سو کتابوں میں سے ۸۵ جل گئیں۔ (قومی آواز)

جشن غالب کے موقع پر غالب کے مسودوں، کتابوں وغیرہ کی نمائش

لکھنؤ ۱۲ مارچ۔ ایشیائی مطالعات کے ادبی شعبہ کے افسر اعلیٰ پروفیسر اسپیجل شیف ۱۵ اور ۱۶ مارچ کو دارالسلام میں ہونے والے جشن غالب میں شرکت کریں گے ان کے علاوہ کچھ اور غیر ملکی ماہر غالب کے بارے میں مقالات پڑھیں گے۔ جشن غالب کا اہتمام غالب کی صد سالہ تقریبات کی کمیٹی کی طرف سے کیا جا رہا ہے اس موقع پر غالب کے مسودوں، کتابوں، تصویروں اور فوٹو گرافوں کی نمائش بھی کی جائے گی۔

غالب کی نظموں کی بنیاد پر ایک تفریحی پروگرام کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس جشن میں مشہور ریڈیو آرٹسٹ انگلی ووہلر شرکت کریں گی۔ یو پی کے گورنر ڈاکٹر گوپالا ریڈی اس جشن کا افتتاح کریں گے ایک مشاعرہ بھی ہوگا جس میں ہندی اور اردو کے مشہور شاعر شرکت کریں گے اس مشاعرہ کی صدارت مرکزی وزیر فخر الدین علی احمد کریں گے۔

افکار کی ۲۲ ویں سالگرہ

کراچی۔ گذشتہ دنوں آرٹس کونسل کراچی میں حکیم محمد سعید دہلوی (ستارۂ امتیاز) کی صدارت میں مشہور ادبی ماہنامہ "افکار" کی ۲۲ ویں سالگرہ منائی گئی جس میں افکار کی ادبی خدمات پر مضامین پڑھے گئے۔ جن حضرات نے افکار کی ۲۲ سالہ ادبی جدوجہد اور کئی بے مثال خاص اشاعتوں مثلاً جوش نمبر، فیض نمبر، غالب نمبر، حفیظ نمبر، مجاز نمبر وغیرہ پر روشنی ڈالی اور مدیر افکار کو خراج عقیدت ادا کیا۔ ان میں جوش ملیح آبادی، حکیم محمد سعید دہلوی، سید حسن، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر انجم اعظمی، سحر انصاری، قریشی، مختار زمن، شمیم احمد دہلوی اور مشرف احمد قابل ذکر ہیں۔ (وحید قاسر)

شمس الرحمٰن فاروقی

نئی شاعری کے بنیادی علائم

کون میرا پوچھنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں
میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے میں کس عرصۂ محشر میں ہوں
دیکھتے سب ہیں مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
اگلے وقتوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں

یہ اشعار پاکستان کے ایک نوجوان شاعر ریاض مجید کے ہیں۔ کوئی بھی چار شعر چاہے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں کسی پیچیدہ شعری صورت حال کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ نئی شاعری کی سب سے بڑی قوت یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل پر محیط ہے اور وہ ان مسائل کو محدود اور مقامی نہ رکھ کر ان کو غیر محدود اور کائناتی پس منظر میں دیکھتی ہے۔ نئی شاعری انفرادی مسائل سے زیادہ اس المناک صورت حال سے دست و گریباں ہونے کی سعی کرتی ہے جس نے ان مسائل کو جنم دیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان چار شعروں میں نئے شاعر کا داخلی کرب اور اس کا DILEMMA بہت خوبی سے واضح ہو گیا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان چاروں اشعار میں صیغۂ واحد متکلم مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اکیلا دیوتا ہوں، میرا مندر جل رہا ہے، میرے پرستار کہاں ہیں؟ میں اپنے ساتھیوں سے مختلف اور تنہا ہوں۔ میں شرمندہ ہوں، اگرچہ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں سب کے سامنے ہوں لیکن کوئی میرے درد سے واقف نہیں۔ اس طرح تمام اشعار کا "میں" ایک مرکزی علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ "میں" شاعر بھی ہے اور شاعر کے عہد کا تھکا ہارا انسان بھی، جو زندگی کے مسائل کے سامنے خود کو بے چارہ اور مجبور پاتا ہے۔ ذات کا غیر ذات سے ٹکراؤ اور نتیجے کے طور پر غیر ذات کی شکست۔ یہ نئی شاعری کا بنیادی مسئلہ ہے۔ نیا شاعر خود کو ایک عدم اتصال صورت حال میں پاتا ہے اور وہ صورت حال یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو کسی نہ کسی تصادم میں گرفتار ہے۔ اس تصادم میں ایک ایسی ناگزیر بے چارگی ہے جو شکست ذات کے حادثے کو پوری طرح المیہ بھی نہیں بننے دیتی۔ المیہ کے لیے کشاکش، کشمکش اور جد و جہد کا عنصر لازمی ہے۔ لیکن نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ وہ پوری طرح المیہ کی عظمت کو بھی نہیں پہنچ پاتا۔ وہ ایک دیوتا ہے لیکن تنہا۔ اس کا ایک مقدس مندر ہے، لیکن جل رہا ہے۔ وہ آوازیں دے رہا ہے کہ میرے پوجنے والے کہاں ہیں؟ لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔ غالب نے کہا تھا ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یعنی شاعر کا وجود مے مرد افگن عشق کا حریف تھا۔ شاعر کے بعد کوئی تاب نبرد نہیں دکھائی دیتا۔ نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ خود وہ بھی حریف مے مرد افگن عشق نہیں ہو پاتا۔ اس موقع پر ٹی ایس ایلیٹ کے مشہور مصرعے یاد آتے ہیں

This is the way the world ends
This is the way the world ends
This is the way the world ends
Not with a bang but with a whimper

یہ دنیا یوں دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑنے کے بجائے ایک مریضانہ سسکی کے ساتھ دم توڑتی ہے۔ ہمارا کرۂ ارض نہیں، بلکہ شاعر کی دنیا ہے، جو تشنۂ و جوئے طلب کا مرد ہے، لیکن ؎

میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

یہ ایک ایسا غم ہے جس میں اپنے ساتھیوں کی نامردی سے زیادہ اپنی مردانگی کا درد ہے، کیونکہ احساس سے عاری دنیا میں حساس ہونا ایک بہت بڑی سزا ہے۔ ممکن ہے شدت احساس کی اس کیفیت نے اس بے نام احساس جرم کو خلق کیا ہو جو دوسروں کے جرم کو بھی اپنے اوپر عائد ہوتے دیکھتا ہے۔ نئے شاعر کی ذہنی صورت حال کا سب سے نمایاں اور انسانیت سے بھرپور پہلو یہ ہے کہ وہ خود کو تمام انسانوں سے الگ نہیں سمجھتا، اس لیے وہ انھیں تلقین و تبلیغ نہیں کرتا، بلکہ ان کے درد کو اپنا درد اور ان کے جرم کو اپنا جرم سمجھتا ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ نئے شاعر کو ایسی آخر کیا پریشانی ہے جو وہ دنیا میں ہر طرف تصادم اور انتشار دیکھتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اکثر نئے شاعر اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن پھر بھی انسانی صورت حال کی ابتری اور بے حالی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کچھ نقاد نئے شاعر پر خلوص کی کمی، ریاکاری اور نقل نویسی کا الزام اس وجہ سے لگاتے ہیں کہ خود نئے شاعروں کی عام زندگی میں عموماً کوئی ایسا انتشار و اختلال نہیں دکھائی دیتا جو ان کی شاعری میں پھیلی ہوئی ابتری کی دھندلی دھندلی فضا کی توجیہ کر سکے۔ یہ تنقید دراصل شاعری کے بنیادی مفاہیم سے بے خبری اور شعر کی اصلیت کے بارے میں غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ورڈزورتھ نے بہت پہلے کہا تھا کہ شاعر عام لوگوں کی ہی طرح کا ایک انسان ہوتا ہے لیکن اس کی قوت احساس و تمیز عام لوگوں سے بلند ہوتی ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ عام لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر شاعر انسانی صورت حال میں ابتری اور افراتفری اور انتشار و اضطراب کا دور دورہ دیکھتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے اس کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ خود اس کی زندگی نسبتاً آرام سے گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ ظاہری سکون و اطمینان باطنی خلش اور الجھن کی نفی نہیں کرتے۔ دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور اکثر رہتے ہیں۔ شاعر چونکہ قوم کا ضمیر ہوتا ہے اس لیے وہ ہر وقت خود کو امتحان گاہ میں پاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

۱؎ ورڈزورتھ یہ قول خلیل الرحمٰن اعظمی دہراتا ہے کہ کون آرام نصیب نہیں تھا جس کی وجہ سے انھوں نے گھبرا [illegible] یہ نظریہ کہ شاعر اسی وقت درد و کرب کا اظہار کرنے کا مجاز ہے جب وہ خود [illegible] الحال ہو، ایک مضحکہ خیز نظریہ ہے اور خود ورڈزورتھ کے INTENT نظریے کی نفی کرتا ہے۔

نیا شاعر خود کو بھی اس وقت جوئے کشمکش میں پاتا ہے جب وہ انسان کو ذہنی و روحانی حیثیت سے دیوالیہ ہوتے دیکھتا ہے۔ وہ خود کو جرم و سزا کے کرب میں مبتلا پاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نیا شاعر انسان پر انسان کے ظلم، اقدار کی شکست و ریخت، معبدوں اور نظریات کے انہدام، مذہب تشکیک اور بے راہ روی کو فرداً فرداً کسی خاص مسئلہ یا واقعہ کے حوالے سے نہیں بلکہ اس تمام صورت حال کو مجموعی اور مکمل حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ پہلے زمانے کا شاعر فسادات، جنگ، قحط، بے روزگاری، بندۂ مزدور کے اوقات، وغیرہ پر الگ الگ نظمیں لکھ کر اپنے احتجاج و کرب کا اظہار کرتا تھا۔ نیا شاعر بھی اپنے کرب کا اظہار کرتا ہے لیکن شعر کو مسائل سے پابند نہیں کرتا۔ وہ IDENTIFICATION سے زیادہ IMPLICATION کا قائل ہے۔

یہیں پر ہم نئی شاعری کی دوسری بنیادی علامت یعنی بالواسطگی INDIRECTNESS یا پیچیدہ استعاراتی بیان یا تمثیلیت SYMBOLISM سے دوچار ہوتے ہیں۔ نئی شاعری کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس کا مرکز و محور شاعر کی اپنی ذات ہے، جو غیر ذات سے متصادم ہو کر پارہ پارہ ہوتی ہے۔ نیا شاعر اس تصادم کا ذکر کسی سیاسی مسلک، یا فلسفیانہ مسئلہ یا مذہبی عقیدے کے حوالے سے نہ کر کے ایک ایسے مبہم لیکن وسیع المعنی انداز میں کرتا ہے کہ مسئلہ کی پوری روح سامنے آجاتی ہے اور اس کا کورا ڈھانچہ پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ اس وسیع المعنی اور مبہم انداز کو اختیار کرنے کے لیے نیا شاعر پیچیدہ استعارہ یعنی SYMBOL کا سہارا لیتا ہے۔ شعری تمثیل، سائنسی تمثیل سے مختلف ہوتی ہے۔ سائنسی تمثیل فی نفسہ کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہ کسی تجریدی تصور کی نمائندگی کرتی ہے، خود اس میں کوئی دل کشی یا حسن نہیں ہوتا۔ شعری تمثیل فی نفسہ حسن اور دل کشی سے عبارت ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی وسیع تر تجریدی تصور کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر بلراج کومل کی نظم "سرکس کا گھوڑا" ملاحظہ ہو:-

سپید اور بھورا بدن کا چھریرا
وہ نٹ کھٹ بچھیرا
خریدا گیا گاؤں کے ایک میلے میں
اس کو قلابازیاں، کرتب، کھیل کود، سکھانے لگے سرکس منڈلی کے
ساتھ وہ کوچہ کوچہ پھرتا رہا اور اس کے بعد وہ سرکس کا گھوڑا
پریشان شہروں میں کرتب دکھاتا
تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتا
اس گاؤں کے ایک میلے میں پہونچا
خریدا گیا تھا جہاں سے وہ بچپن میں، لیکن وہاں ــ!
وہاں کون تھا؟ اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ خوب صورت نٹ کھٹ، سفید اور بھورا بچھیرا بہ ذات خود ایک دلکش، پراسرار اور معنی خیز شے ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ گاؤں کی معصومیت، بے گناہی اور سادگی سے شہروں کی گھٹن، بے ضمیری اور ہلچل کی طرف ناگزیر سفر کی تمثیل بھی ہے۔ اس کے علاوہ بچھیرا انسان کی بھی تمثیل ہے جو بچپن سے بڑھاپے تک دنیا، زمانے اور تقدیر کے ہاتھوں طرح طرح کے کرتب دکھاتا رہتا ہے، اور بچپن کی معصومیت کو سن بلوغ کی پختہ کار گناہ گاری کے ہاتھوں ملیامیٹ کرتا رہتا ہے۔ یہ بچھیرا ان بدنصیب انسانوں کی بھی تمثیل ہے جو زبردستی اپنے مانوس ماحول سے الگ کر دیے جاتے ہیں اور پھر جب وہ اپنے مانوس ماحول میں واپس پہنچتے ہیں تو وہاں خود اجنبی اور غیر پاتے ہیں۔ یہ بچھیرا انسان کے اس المیہ کا بھی نشان ہے کہ انسان فی نفسہٖ بے مروت اور بھول جانے والا ہوتا ہے اور وہ ان کو بھی بھلا دیتا ہے جو مجبور و مظلوم ہوتے ہیں۔

بالواسطہ استعاراتی بیان کی ایک اور خوب صورت مثال شہریار کی ایک چھوٹی سی نظم ہے:

ایک نظم
مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

یہاں استعاراتی بیان، طنز کے ساتھ مل کر ایک نئی سمت میں مڑ گیا ہے جہاں طنز المیہ میں بدل جاتا ہے۔ نظم کا بنیادی مصرع ہے ؎

آنکھوں سے کہو اب مانگیں

انداز بیان کے ابہام نے معنی کو وسعت دے دی ہے۔ آنکھیں کس کی ہیں؟ کون ان سے کہے کہ وہ مانگیں؟ "آنکھوں سے کہو" یہ کون کہہ رہا ہے؟ اور "اب مانگیں" کے پیچھے کتنے کرب کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ شاید اس سے پہلے آنکھوں نے مانگنے کی ہمت ہی نہ کی تھی۔ یا اگر کی تھی تو اس نتیجہ کے ساتھ کہ جس سے نہ مانگنا ہی بہتر تھا۔ پہلے زمانے کی شاعری میں ان پیچ در پیچ کیفیات کا اظہار ممکن نہ تھا کیوں کہ بلاواسطہ اور واضح بیان، اشارہ اور کنایہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور بات جب واضح کر دی جاتی ہے تو معنی کے امکانات کی موت ہو جاتی ہے۔ نئی شاعری معنی خیز امکانات کی شاعری ہے واضح بیانات کی نہیں۔

نئی شاعری کا تیسرا بنیادی مسئلہ اسلوب اظہار اور ہیئت کا ہے۔ نئی شاعری ہیئت کو موضوع سے الگ نہیں دیکھتی اس لیے نئی شاعری کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نئی ہیئت وضع کی جائے تاکہ ہم نئے موضوعات کا احاطہ کر سکیں۔ نئی شاعری کا سفر اس نئی ہیئت کی تلاش سے عبارت ہے جو خود مکمل ہو اور جو کسی منطقی نظام کے بغیر محض اپنے وجود کو بنا بر شعری پیکر کو جنم دے سکے۔ افتخار جالب کی نظم "جبلتوں سے استنباط ہو" کا آغاز ملاحظہ ہو:

اک علامت خواب کر جن کا جبلتوں سے استنباط ہو
حصہ بہ حصہ سطحوں سے لپٹا جھٹ پٹے کی آنکھیں سیڑھی چھوڑ کر
روشنی کا طرفداں دھارا بلندی کا تماشا جوں یہاں گزرتا ہے

نظم آزاد تلازموں، جھلکتے ہوئے تصویری پیکروں (IMAGES) اور غیر مربوط دھند کے سہارے ایک کشاکش کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ پوری نظم ایک چکر کھاتے ہوئے کرہ کی طرح ہے جس کا سرا ہے نہ انجام۔

نئی شاعری اسی طرح تخریب و تعمیر کے عمل سے گزر کر ایک نئی دنیا بنانے کی کوشش میں ہے۔ افتخار جالب اس کوشش کی انتہائی شکل ہیں، لیکن تمام نئی شاعری بہر حال کسی نہ کسی حد تک، ان کی ہم نوا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

موجودہ دور میں ایک طرف تو شعر و ادب کے بعض نازک اور پیچیدہ مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی ہوش مندی، ذہنی توازن، مذاقِ سلیم، عالمی ادب سے آگاہی اور تہذیبی و سماجی حوالوں سے واقفیت ضروری ہے تو دوسری طرف بعض مسائل ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے محض ہنسنے ہنسانے اور تفریح حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انھیں مسائل میں سے ایک دلچسپ مسئلہ اپنا نام کسی اخبار یا رسالے میں چھپا ہوا دیکھنے کا شوق ہے۔ وہ لوگ جو تخلیقی کرب سے گزرتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں گزرتے مگر غزل، نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول، انشائیہ یا ادب کی کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی کی تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے ہیں انھیں تو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے اس لیے کہ ادب کا دائرہ اور اس کی مملکت اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہر درجہ اور ہر قماش کی تحریر کی کھپت اور سمائی ہے لیکن جن بے چاروں کو مصرعہ موزوں کرنا تو در کنار نثر کی چند ایسی سطریں لکھنے کی صلاحیت بھی ودیعت نہ ہوئی ہو جن پر تھوڑی دیر کے لیے بھی ادب یا ادب نما قسم کی کسی چیز کا دھوکا ہو سکے وہ کیا کریں! ایسے لوگوں نے بھی اپنے لیے ایک نسخہ فراہم کر لیا ہے وہ یہ ہے کہ شعری و ادبی تخلیقات کے بارے میں اپنے "زریں خیالات" اور "قیمتی تاثرات" کو قلم بند کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوشش کبھی تو "مکاتیب بنام مدیر" کی زنبیل میں جگہ پا جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسا رسالہ بھی نکل آتا ہے جو ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو صفحے کے ان منتشر اور بے ربط خیالات کے مجموعے کو نقد و انتقاد کا نمونہ سمجھ کر شائع کر دیتا ہے تاکہ ناظرینِ باتمکین کو عبرت ہو اور "گم کردہ راہ" ادیبوں اور شاعروں کو توبہ و استغفار کی راہ دکھائی جا سکے۔

اس قسم کی تحریروں سے دلچسپی لینے اور دل خوش کرنے والوں کو مژدہ ہو کہ ان شوقین حضرات نے اب اپنا ایک رسالہ نکال لیا ہے۔ رسالہ کا نام "خونِ ناب" ہے۔ ۴۲ صفحوں کا یہ سہ ماہی رسالہ اتنا کم قیمت اور گھٹیا کاغذ پر ادنیٰ درجے کی کتابت و طباعت کے ساتھ حیدرآباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مدیرہ کی حیثیت سے عالیہ عروج کا نام ہے اور شریک مدیر (شریک مدیرہ؟) محمد غوث محی الدین عروج صاحب ہیں۔ مدیرہ اور شریک مدیر یا مدیرہ دونوں کے نام ہم نے پہلی بار چھپے ہوئے دیکھے ہیں، ممکن ہے حیدرآباد کے بعض مقامی اخبارات میں مکتوب نویس کی حیثیت سے یہ لوگ پہلے بھی اپنا نام چھپوا چکے ہوں جس کا ہمیں علم نہیں۔ بہرحال اس کا اداریہ دیکھیے جس میں مدیرہ اعلان فرماتی ہیں کہ:

"ہم ایسے وقت میں خونِ ناب نکال رہے ہیں جب اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں"

آگے چل کر فرماتی ہیں:

"آج کے ادبی مسائل میں ایک مسئلہ قدیم ادب (ترقی یافتہ کلاسیک درجہ رکھنے والا ادب) ترقی پسند ادب (جس کی اساس لازم سیاسیات و معاشیات ہے) اور جدیدیت (جو ابہام و اہمال کا شکار ہے) کا تصادم ہے۔"

قدیم ادب، ترقی پسند ادب اور جدیدیت کی جو تعریف توسین کے اندر مدیرہ نے فرمائی ہے اس پر سر دھنیے اور پھر ان کے تصادم کو آج کا اہم مسئلہ قرار دینا اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور خونِ ناب کی اشاعت سے اس بے چاری کے علاج معالجے کا انتظام کیا جا رہا ہے، مدیرہ کے بلند عزائم کو سمجھنے کے لیے یہ چند الفاظ کافی ہیں جو ۴۲ صفحوں میں تو لطف اس وقت حاصل ہوگا جب اس رسالے کے مضامین پر نظر ڈالی جائے گی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی اس برادری نے رسالہ نکالنے کا حوصلہ تو کر لیا لیکن اس کے لیے مواد کہاں سے آئے۔ ان کے اپنے اپنے ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کے مضامین کتنی جگہ گھیرتے اس لیے ان مضامین کو جن کا کل مواد کسی پوسٹر یا اشتہار سے زیادہ نہیں کسی باقاعدہ رسالے کی زینت بنانے کے لیے بعض پرانے مضامین کے آگے پیچھے شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ جدید شاعری کا "انحطاط" کے عنوان سے عبادت بریلوی کا ایک مقالہ بغیر کسی حوالے کے درج کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ موصوف کی دس سال پہلے کی ایک کتاب "جدید شاعری"

شفا گوالیاری

غزل

کسی کے سامنے خالی کہیں لبریز جام آیا
مجھے اب تک نہ اے ساقی شعورِ اہتمام آیا
جنونِ عشق کی راہوں میں ایسا بھی مقام آیا
کہ جب آواز دی ان کو لبوں پر اپنا نام آیا
تغیر ہر دور میں ہم کو یہی رنگِ نظام آیا
قفس والوں کا خونِ دل چمن والوں کے کام آیا
کچھ اس انداز سے مجھ کو سنائی داستاں اپنی
جہاں آنا تھا نام ان کا وہاں بھی میرا نام آیا
خودی جب بے خودی سے ماورا! گزری ہے اک منزل
ان ہی سے اُن کو پوچھا ہے کبھی وہ بھی مقام آیا
شبِ غم وہ نہیں تو ان کی یادوں کا سہارا تھا
قریبِ صبح سے پہلے اُجالوں کا پیام آیا
بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں غنچہ و گل کو
شفا گلشن میں مشکل سے نیا دورِ نظام آیا

سے نقل کیا گیا ہے، اسی طرح ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کا وہ ترجمہ جو جمیل جالبی نے کیا ہے بغیر حوالے کے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے جو سات آٹھ برس پہلے "ایلیٹ کے مضامین" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

خیر ان پڑھے ہوئے مضامین کو دوبارہ پڑھوانا ان حضرات کا مقصد بھی نہیں ہے، ۴۸ صفحے آخر کس طرح پر ہوتے۔ جو مضامین ہمارے مطالعے کے لیے شائع کیے گئے ہیں ان میں ایک مضمون میر احمد علی قادری کا ہے جس کا عنوان ہے "شہریار کی شاعری کا جائزہ"۔ چونکہ اس رسالے کی مدیرہ اور اس مضمون کے راقم میر احمد علی قادری صاحب کو کہیں سے پتہ چل گیا ہے کہ جدیدیت اس چیز کا نام ہے جس میں ابہام و اہمال ہو اس لیے ہر اس شاعر کے یہاں یہ صفت لازمی طور پر موجود ہوگی جس کو لوگ جدید کہتے ہیں۔ مضمون نویسی کے شوق میں موصوف نے جدید شاعروں کے مجموعوں کی تلاش کی ہوگی تو سب سے پہلے غالباً انھیں شہریار کا مجموعہ "اسم اعظم" کہیں سے دستیاب ہو گیا ہوگا۔ اس مجموعے کو پڑھنا، شاعر کے تجربات و محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اردو شاعری کے اسالیب اور اس کے ارتقا کو سمجھنا، رمز و ایما کی زبان سے موانست پیدا کرنا، یہ سب شرطیں تو اس کے لیے ہیں جو سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو لیکن قادری صاحب کو تو کچھ لکھنے اور اپنے نام سے چھپوا دینے سے کام۔

شہریار کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "سائے" قادری صاحب سب سے پہلے پوری نظم نقل کرتے ہیں۔

اداس شہر کی گلیوں میں رقص کرتے ہیں
بلائیں لیتے ہیں آوارہ گرد خوابوں کی
دعائیں دیتے ہیں بچھڑے ہوؤں کو ملنے کی
سنوارتے ہیں خم گیسوئے تمنا کو
پکارتے ہیں کسی اجنبی مسیحا کو
سمیٹ لیتا ہے جب چاند اپنی کرنوں کو
تو دل کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں
یونہی ہمیشہ طلوع و غروب ہوتے ہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"پوری نظم پڑھ جائیے، نہ کوئی مبتدا، نہ خبر، مکروہ ابہام اور قبیح اہمال۔"

چلیے تنقید ختم ہو گئی۔ آگے لکھتے ہیں:

"ان کی نظم لازوال سکوت بھی مجذوب کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔" نظم یہ ہے:

بسیط بن، گھنے پیڑوں کی ہری شاخیں
کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگناتی تھیں
کبھی کبھی کسی پتے کا دل دھڑکتا تھا
کبھی کبھی کوئی کونپل درود پڑھتی تھی
کبھی کبھی کوئی جگنو الگ چمکتا تھا
کبھی کبھی کوئی طائر ہوا سے لڑتا تھا
کبھی کبھی کوئی پرچھائیں چیخ پڑتی تھی
اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
سرہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی لیکن
خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
اور اس کے بعد میں دیوانہ وار ہنسنے لگا
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

اس طرح قادری صاحب شہریار کی نظم "خوابوں کا مجاور" نقل کرکے لکھتے ہیں:

"اس نظم کا خالق انتشاریاتی بیماری کا شکار ہے"

اور نظم "نیا کھیل" نقل کرکے اس پر یہ فقرہ چسپاں کرتے ہیں

"پوری نظم پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جو پاگل ہو کھڑا ڈگڈگی بجا کر مجمع لگانے کے لیے فضا میں ہاتھ اچھال کر عوام کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں ان نظموں کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتا اس لیے کہ شہریار ان جدید شاعروں میں ہیں جن پر اب تک کسی سنجیدہ اور معقول شخص نے ابہام و اہمال کا الزام نہیں لگایا ہے۔ ان نظموں کا بہت عمدہ تجزیہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک مضمون میں کیا ہے جو نقوش (لاہور) اور مزاج (بھوپال) میں شائع ہو چکا ہے۔ میں نے تو قادری صاحب کے "گراں قدر خیالات" محض اس لیے نقل کیے ہیں کہ ان سے آپ بھی محظوظ ہوں اور اس بات پر غور کریں کہ "جوش نقد اشاعت"[1] نے ان سے کیا کیا حماقتیں سرزد کرائی ہیں۔ شہریار تو خیر ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں کسی جدید شاعر کی کوئی نظم اپنے ابہام و اشکال کے باوجود اس قدر مضحکہ خیز اور سطحی نہیں ہو سکتی جیسی کہ قادری صاحب کا یہ بے سر و پا مضمون۔ یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ اس رسالے میں اس سے بھی زیادہ مزے دار چیزیں ہیں۔ جی چاہے تو پڑھیے اور اس عجیب و غریب ذہنیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کیجیے۔

---

[1] غالب پر جب تنقید و تحقیق کا بازار گرم ہوا تو ہر ایرے غیرے نے طبع آزمائی شروع کر دی۔ شاد عارفی نے اس رجحان پر طنز کیا ہے ؎

جو بھی نقد اشاعت میں لگے رہتے ہیں
آپ غالب کی حجامت میں لگے رہتے ہیں

انیس انور

مکتوب لندن

اپریل میں آفاق کا سالنامہ شایع ہوگا

آفاق کا ماہ اپریل ۱۹۸۸ء کا شمارہ سالنامہ ہوگا جس میں جدید و قدیم ارباب فکر و دانش کی قلمی کاوشوں کے نمونے شامل ہوں گے اس تاریخی نمبر میں انگلستان کے ادیبوں، شاعروں اور انشائیہ نگاروں کی نمائندگی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

فروری کے آفاق میں ستارے ٹوٹتے ہیں، افسانہ قمر علی عباسی، خیال، نظم عبدالرؤف عروج، سجدہ سہو، افسانہ انور سدید، مکان کرایہ پر خالی ہیں، انشائیہ حبیب فخری، زنگ اندھیرا زینہ، افسانہ کنار پاشی، اے دل ناداں، افسانہ یاسمین سعید۔ غزل، نادرشاہ بخاری، سرگزشت، نظم عطاجالندھری، غزل صداقت جبیں تنویر۔ شیر حاجیکر، افسانہ تصدق سہیل، تاب انتظار نہیں، نظم عیش ناصری۔ لمحہ نظم شاکر لدھیانوی اور شخصیت پرستی یا پیر ورد شپا غلو کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

انتخاب ملاحظہ ہو!

غزل۔ راشدہ جبیں

شمع احساس جلانے سے نکل آتے ہیں
وہ جو آنکھوں میں چھپے بیٹھے ہیں پروانے سے
لوگ تو ناگ ہیں ڈس لیتے ہیں دل والوں کو
آپ کیوں روٹھ چلے لوگوں کے بہکانے سے

غزل۔ شاہدہ قریشی و شمیم

چار سو ایک فضا ایک سی تنہائی تھی
ہم سے پہلے یہ کہاں انجمن آرائی تھی
جل بجھے شمع کی مانند ہمیں کیا معلوم
صبح دم باد صبا تیری خبر لائی تھی
کیا خبر راہ میں کس کس سے ملاقات ہوئی
زندگی ورنہ تمہاری ہی طرف آئی تھی
شہر در شہر پھرے قریہ بہ قریہ گھومے
اپنی فطرت بھی تو ہر رنگ میں ہرجائی تھی

جھنگیات۔ استاد جھنگی

اگر ہوا لندن میں پیدا احساس جھنگی
یورپ سے جو چلی ہے وہ تہذیب ننگی
اللہ رکھے ملک کی بوٹی کو سلامت
لندن میں بھی موجود ہیں چرس کی بھنگی
ہم اپنے وہاں اس کو جانتے ہیں "صاحب"
منہ پھیر کے چلتا ہے یہاں ہم سے فرنگی
اس وقت کہیں ہوں گے تو ہم اپنے وطن میں
جب یاد انہیں آئیں گے استاد جھنگی

حضرت ناصح بھی پاپ کا شوق فرمانے لگے
اور جام ناب پی کر وجد میں آنے لگے
مجھ سے بولے سلامت خوب ہیں دو ہمیں کے غلام
یوں ہی تہذیب اپنانے پہ اکسانے لگے

غزل۔ نادرشاہ بخاری

ستارے ٹوٹتے ہیں شب کا پیٹ بھرتے ہیں
سحر کے نام سے ظلمت پرست ڈرتے ہیں
کبھی کبھی ہمیں احساس تک نہیں ہوتا
وہ دل کی راہوں سے کچھ اس طرح گزرتے ہیں
نہ جانے زیست میں کون سی ہے رعنائی
عوام جس کی تمنا میں لوگ مرتے ہیں
ہمیشہ جن کی نگاہوں میں ہم کھٹکتے رہے
بڑے خلوص سے اب ہم کو یاد کرتے ہیں
جہاں جہاں کبھی چھوڑے تھے ہم نے نقش قدم
وہاں سے یاروں کے اب کارواں گزرتے ہیں

لمحہ۔ شاکر لدھیانوی

ایک لمحہ،
کس قدر مصروف ہے
بات کرنے کی اسے فرصت نہیں!
اس کے آگے
ان گنت کاموں کی اک فہرست ہے!!
ایک لمحے نے جنم دی ہیں ہزاروں زندگی کی صورتیں!!
زندگی کی لذتیں،
زندگی کی وحشتیں،
ایک لمحے کے کرم کا فیض ہیں!!
لمحۂ مصروف کو میں دیکھتا ہوں چار سو!
چن رہا ہے نقش ہائے دلنشیں،
اور مزین کر رہا ہے نقش ہائے زندگی!
نیند کی ماتی سنہری خواب گاہوں کے چراغ،
نشے سے بھرپور روشن جلوہ گاہوں کے ایاغ،
ہر تپتی کلی پر ڈولتے بدمست دماغ،
ایک لمحے کے کرم کا فیض ہیں!!

مراسلات

کچھ غالبیہ کے بارے میں

میں کئی سال سے مرزا غالب کے بارے میں معاصرین کی تحریریں اور بیانات (منظوم و منثور دونوں) جمع کر رہا ہوں اور اس سارے مواد کو غالبیہ کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے پہلے تین ابواب نگار رامپور میں شائع بھی کر چکا ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غالب سے متعلق سارا خام مواد یکجا ہو جائے اور محققین اور ناقدین کو ادھر ادھر تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ یہ سارا مواد میں نے کئی ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ میں نے حتی الامکان موضوع سے متعلق تمام گوشوں کی چھان بین کی ہے لیکن اس کے باوجود اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ بعض مفید مطلب تحریریں میری نظر سے نہ گزر سکی ہوں۔ اس لیے میں غالبیات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایک نظر ابواب کی تقسیم کو ملاحظہ فرمالیں اور ان سے متعلق جو کچھ ان کے علم میں ہو یا ان کے پاس ہو اس سے مطلع فرمائیں۔ میں اس لطف و کرم کے لیے بے حد شکر گزار ہوں گا۔ اور ان عطیات کو مرحمت فرمانے والے کے حوالے سے کتاب میں درج کروں گا۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ میری نظر سے بعض ایسی تحریریں گزری ہیں جنھیں غالبیہ میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ اور انھیں میں نے نقل بھی کر لیا مگر میری یادداشتوں کا ایک فائل ضائع ہو گیا اور یہ تحریریں میری نظر سے اوجھل ہو گئیں مثلاً میں نے غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات نوٹ کیا تھا جس کا ایک مصرع یہ تھا ؎

غالب جو مر گیا ہے تو دلی اداس ہے

اب کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ کس کا تھا اور میں نے کہاں سے نقل کیا تھا بہر حال مندرجہ ذیل ابواب سے متعلق جو بھی مدد کی جاسکتی ہو مجھے امید ہے کہ میں اس سے محروم نہ ہوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(ڈاکٹر علی خاں رامپور رضا لائبریری رامپور (یوپی))

پہلا باب۔ تذکروں میں غالب کا ذکر

دوسرا باب۔ ملاقاتیوں کے بیانات

تیسرا باب۔ اخبارات میں غالب کی یا غالب پر تحریریں اور خبریں

چوتھا باب۔ غالب کی زندگی میں لکھے ہوئے ایسے اشعار جن میں غالب کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان میں قطعات تاریخ وغیرہ بھی ہیں۔ جیسے غالب کے بہرے ہونے کی تاریخ جو صاحب عالم مارہروی نے کہی تھی یا غالب کی وفات کی غلط خبر اڑ جانے پر جو قطعات کہے گئے، یا غالب کی مدح میں قصائد متفرق ایک ایک دو دو شعر بھی اس باب میں آئیں گے۔ جیسے یہ دو شعر ؎

(۱) چو در یوم غالب در آزردہ ماند صہبائی
بہ خاطرم ہیچ یاد از خاک پر از غم نمی آید (صہبائی)

(۲) عمل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے
نہیں ہے سایۂ بال ہما ضرور (دیوان داورخان)

پانچواں باب۔ غالب کی کتابوں پر دیباچے اور تقاریظ اور قطعات

چھٹا باب۔ غالب کی وفات پر تبصرے

ساتواں باب۔ غالب کی وفات پر مضامین

آٹھواں باب۔ معاصرین کے خطوط جس میں غالب کا ذکر آیا ہو یا جو غالب ہی کے نام لکھے گئے ہوں۔

نواں باب۔ متفرقات ایسی تحریریں جن کا تعلق ان حضرات سے ہے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا ان کے دوست تھے شاگرد تھے۔ ایسی اشعار کے مطالب وغیرہ جو غالب کے حوالے سے درج کیے جائیں گے۔

یہ بھی عرض کردوں کہ اگر کسی شخص نے غالب کے بارے میں کوئی بیان دیا ہے لیکن اس شخص کی معلومات براہ راست نہیں ہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے ذریعے ہیں اور وہ دوسرا شخص غالب کے عہد کا ہے تو یہ بیان بھی کتاب میں شامل ہوگا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص یہ بیان کرتا ہے کہ غالب نے میرے دادا کو اپنے فلاں شعر کا یہ مطلب بتایا تھا۔ اب یہ بیان غالبیہ کے دائرے میں آتا ہے، یا جیسے امیر مینائی کے حوالے سے جلیل مانک پوری نے غالب کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ رام پور سے واپسی کے موقع پر ایک بھشتی نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے امداد چاہی تھی اور غالب نے اس کی مدد کی یہ بیان اگرچہ امیر مینائی کے قلم سے نہیں ہے مگر چونکہ انھوں نے خود اپنے شاگرد سے بیان کیا ہے اور امیر مینائی غالب کے ملاقاتیوں اور ہم عہد شخصیتوں میں سے ہیں اس لیے غالبیہ میں اسے شامل کر دیا جائے گا۔

(ڈاکٹر علی خاں)

ایک استفسار

آج کل اردو ڈائجسٹ، شاہکار ڈائجسٹ، عارض ڈائجسٹ، شبستاں ڈائجسٹ، سہا ڈائجسٹ، جاناں ڈائجسٹ اور ادا کار وغیرہ ڈائجسٹ نکل رہے ہیں۔

اصطلاحی معنوں میں DIGEST ہضم کرنا، ہضم ہونا کو کہتے ہیں در اصل یہ لفظ قدیم رومی قوانین کے مجموعے کا نام تھا جو شہنشاہ روم جسٹینین کے حکم سے مرتب ہوا تھا۔ ترتیب دینا۔ "مدون کرنا، مرتب کرنا، خلاصہ کرنا" کے معنوں میں بھی مستعمل ہو سکتا ہے مگر آج کے روزمرہ کی بول چال کی نسبت میرے خیال میں "نچوڑ" موزوں رہے گا۔ اس کے لیے ہم اردو میں کیا بدل لائیں؟ اگر اس پر ارباب زبان، روشنی ڈالیں تو میں ممنون ہوں گا۔

(نجم الحسن انجم ادیب)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

میں نے ۱۲ اپریل ۱۹۹۷ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے جدیدیت اور ادب سے متعلق سیمینار میں جدید اردو نظم پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ گفتگو بمبئی کے شمارہ ۳۰ میں مدیر گفتگو سردار جعفری کے قائم کیے ہوئے "خط مستقیم اور خط منحنی کی شاعری" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ سردار جعفری

نے ڈاکٹر قمر رئیس کے کسی خط کے حوالے سے میرے مضمون پر ایک فٹ نوٹ چھاپا ہے جس میں مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے فیض کی شاعری کے بارے میں جو خیالات سیمینار میں پیش کیے تھے وہ ان خیالات سے مختلف تھے جن کا اظہار میں نے شائع ہونے والے مضمون میں کیا ہے۔ میں قمر رئیس کے اس بیان کی اور اس بیان پر سردار جعفری صاحب کے نوٹ کی مکمل طور پر تردید کرتا ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ فیض سے متعلق جو بیان مجھ سے منسوب کیا گیا ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے اور اس کا میرے بیان سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے فیض کی شاعری کے لیے جو الفاظ سیمینار میں استعمال کیے تھے ٹھیک وہی الفاظ میرے اس مضمون میں شامل ہیں جو گفتگو میں شائع ہوا ہے۔

(براج کومل)

(اردو "جدیدیت اور ادب" کے موضوع پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے جو سیمینار منعقد کیا گیا تھا اس میں براج کومل نے "جدید نظم، چند پہلو" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ یہی مقالہ گفتگو بمبئی شمارہ (۲) میں شائع ہوا ہے۔ سردار جعفری نے قمر رئیس کے حوالے سے یہ نوٹ دیا ہے کہ اس مقالے میں فیض سے متعلق رائے بدل دی گئی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے قمر رئیس صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے یا ان کے حافظے نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ اس مضمون کو میں نے بھی سنا تھا اور اس کا اصل مسودہ میں نے براج کومل سے سیمینار کے بعد اس کتاب میں شامل کرنے کے لیے لے لیا تھا جو شعبے کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔ اس مضمون کی جو نقل گفتگو کے لیے بھیجی گئی وہ اصل کے مطابق ہے اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی (کنوینر سیمینار)

اردو بھون

ہماری زبان کی اشاعت مورخہ ۲۲ فروری ۷۸ء کے اداریہ میں یہ خبر پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی عمارت کے لیے حکومت ہند نے دہلی میں ایک قطعہ زمین عنایت کیا ہے، تعمیر کا کام شروع کرنے کے لیے انجمن کے پاس تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے موجود ہیں، عمارت کا سنگ بنیاد وزیر اعظم کے ہاتھوں بہت جلد رکھا جائے گا اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عمارت سال بھر کے اندر مکمل ہو جائے۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ خبر پڑھ کر کہ عمارت کا نام اردو بھون رکھے جانے کی تجویز ہے، دم بخود ہو گیا۔ انجمن ترقی اردو کی سب سے بڑی عمارت کا نام دلی شہر میں اردو بھون رکھا جا رہا ہے! اور اردو کے جاں نثاروں کی طرف سے یہ تحریک ہو رہی ہے! چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

میں ذاتی طور پر ہندوستان کی تمام زبانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ہندی کو صرف سرکاری بلکہ ایک پیاری زبان سمجھتا ہوں۔ سنسکرت زبان سے مجھے محبت ہے اور اس کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس سے اتنی شناسائی پیدا کر لی ہے کہ اہل زبان کی طرح بولتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی زبان کو تیتر بٹیر بنانے کا ہرگز روادار نہیں ہوں۔ ہندی میں آنند بھون، بھارتی بھون، وگیان بھون اور راشٹرپتی بھون بڑے سندر نام ہیں لیکن اردو بھون، غالب بھون اور آزاد بھون جیسے نام میرے ذوق پر بہت گراں گزرتے ہیں۔ بھون کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اردو میں منزل، محل اور گھر جیسے خوب صورت الفاظ موجود ہیں۔ عربی دار اور بیت کی مدد سے بھی عمارتوں اور اداروں کے اچھے اچھے نام جیسے دارالمصنفین، دارالاشاعت، دارالعلوم، بیت اللہ اور بیت المال بنائے گئے ہیں اور مقبول ہیں۔ بھون کا مزاج اردو کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ اگر اس طرح کے الفاظ اردو پر لادے گئے تو اس پیاری زبان کی نزاکت، اس کی دلکشی اور اس کا بانکپن ختم ہو جائے گا۔ خصوصاً اس قسم کا اقدام اگر انجمن ترقی اردو کی طرف سے ہوا تو اس کے اثرات بہت خطرناک ہوں گے۔ ظلم کی بنیاد دنیا میں بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ہر آنے والا اس پر اضافہ کرتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی آنکھوں کے سامنے ہماری زبان کا نام "ہماری بھاشا" اور "اردو ادب" کا نام "اردو ساہتیہ" رکھ دے گی۔ یہی حال رہا تو کسی دن خود انجمن ترقی اردو کا نام "اردو [illegible] سمیتی" رکھنا ہوگا۔ اگر ہم محل کی جگہ بھون، تقریر کی جگہ بھاشن، ادب کی جگہ ساہتیہ، [illegible] کی جگہ [illegible]، خبر کی جگہ سماچار استعمال کرنے لگیں تو پھر اردو کے پاس رسم خط کے سوا کیا رہ جائے گا؟ پھر ہم اس پر غور کیوں کریں کہ ہمارے ہندی دوست بھائیوں کو ایک اچھا خاصا [illegible] حالی، اقبال اور آزاد کی تحریروں کو سامنے رکھ کر بھی اردو کو ہندی کی شیلی کہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ہندی کے ایسے ایسے بوجھل شبد استعمال کیے بغیر اپنے خیالات ادا نہیں کر سکتے تو پھر ہم اردو کے لیے ہندی سے ایک علیحدہ مستقل زبان کی حیثیت کا مطالبہ کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ ممکن ہے بعض حضرات اردو بھون کے نام کے متعلق یہ دلیل پیش کریں کہ آخر نام میں کیا رکھا ہے؟ میں ان سے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ثقافت، تہذیب، اور زبان پر ناموں کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ زبانیں دوسری زبانوں کے نام ضرورت کے لیے استعمال کرتی ہیں تو بڑی احتیاط سے انھیں اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ انگریزی میں ابن سینا ابن رشد صلاح الدین، وادی الکبیر اور جبل الطارق کیا سے کیا بن گئے۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے ملک میں انگریزوں نے ہمارے مختلف شہروں کے نام کس طرح بدل کر رکھ دیے۔ عربوں نے غیر زبان کے ناموں کو اپنانے میں کیسی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ سسلی کے لیے صقلیہ، ٹولیڈو کے لیے طلیطلہ، الوریم کے لیے شوریہ، انگلینڈ کے لیے انکلترا، اگست کے لیے اغسطس اور چرچل کے لیے تشرشل وضع کیے گئے۔ یہ سارے الفاظ عربی زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ افسوس ہے کہ ساری دنیا زبان کے معاملے میں اس قدر احتیاط برت رہی ہے اور ہماری پہلی انجمن کا یہ عالم ہے۔

مجھے امید ہے کہ مرکزی انجمن کے ارباب حل و عقد ان معروضات پر غور

کر گئے تھے۔ غریب اردو کا کاروان تنی دشمنوں کے طوفان سے گزر رہا ہے اور ابھی اسے بڑی دشوار گزار منزلیں طے کرنی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ذرا ذرا سی باتوں پر ابھی تو لگن ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلوں کے ساتھ یہ رشتہ بنا رہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(مسعود حسین)

آغا خلش کاشمیری کے مراسلہ کے بارے میں

جناب آغا خلش کاشمیری کا مراسلہ زیر عنوان "الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں" (مطبوعہ ہماری زبان مورخہ یکم فروری ۱۹۶۸ء) پیش نظر ہے۔ اس ضمن میں ذیل کی معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(۱) خلش صاحب نے موضوع زیر بحث سے ہٹ کر جو در پردہ چوٹیں اور ذاتی حملے کیے ہیں اور اپنی دانست میں زور قلم کا بہت شاندار مظاہرہ کیا ہے میں اس کو نظر انداز کرتا ہوں۔ ممکن ہے وہ اپنی مجروح انا کی تسکین کے لیے ادبی تکنیک اور سستی فقرے بازی کا سہارا لینے پر مجبور رہے ہوں۔ لیکن میں اخلاقاً بھی اس نوع کی روش اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ع

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

ثبوت کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا پچھلا مراسلہ ملاحظہ فرمایا جائے جس میں شروع سے آخر تک گفتگو کا خالص علمی انداز اختیار کیا گیا ہے اور ذاتی طنز و طعن کی کہیں کوئی خفیف سی آمیزش بھی نہیں ہے۔

(۲) میں نے خلش صاحب کے مراسلے میں ۲۶ اغلاط و مسامحات کی نشان دہی کی تھی ان میں سے ۱۶ کے بارے میں خلش صاحب نے جوابی اظہار خیال کیا ہے لیکن اپنی تمام تر تاویلیں باتیں بنانے کے باوجود کسی اعتراض کو غلط ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ دس کے بارے میں انھوں نے خاموشی اختیار کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان اس غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ کسی مختصر سے سطری مراسلے میں دس غلطیوں کا ہونا بھی کچھ کم عبرت انگیز نہیں ہے۔ بہرحال ہماری زبان کے قارئین پر اور یاد رہے کہ خود خلش صاحب کے قول کے مطابق ہماری زبان کے قارئین میں با مذاق ہی نہیں بلکہ خاک شناس بھی ہیں) یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ یہ صاحب جو تمام نثر نگاروں کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں اور اس شوق کی پیروی میں طعن و تشنیع، تضحیک اور تہدید جیسے حربوں سے بھی بے دریغ کام لیتے ہیں، جب خود لکھنے پر آتے ہیں تو مشکل ہی کوئی صحیح جملہ ان کے قلم سے نکلتا ہے۔

(۳) خلش صاحب اپنے ہر مراسلے میں اس امر کا اعلان ضرور کرتے ہیں کہ اردو ان کی اکتسابی زبان ہے۔ معلوم نہیں اس امر کی پیہم تشہیر سے ان کا کیا مقصد ہے اور وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر اس کا کوئی مطلب نکل سکتا ہے تو یہی کہ اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے اور اس کے علاوہ روزمرہ پر آپ نے خاطر خواہ عبور حاصل نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے آپ فارسی عربی کے کچھ الفاظ کے معنی جانتے ہوں، لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ وہ الفاظ اردو زبان کی تحریر و تقریر میں کس ڈھب سے استعمال ہوں گے۔ تو پھر کوئی دوسرا کام دیکھیے۔ زبان و ادب کے بہت سے مختلف شعبے ہیں۔ اپنی ادبی کارگزاریوں کے لیے کسی ایسے شعبے کا انتخاب کیجیے جو آپ کی صلاحیتوں سے میل کھاتا ہو۔ دوسرے لکھنے والوں کی ٹانگ گھسیٹتے رہنا کوئی بامعنی مشغلہ نہیں ہے۔

(۴) خلش صاحب کا مراسلہ زیر نظر بھی اغلاط زبان سے خالی نہیں ہے۔ لیکن جہاں کٹ حجتی، بے جا ضد اور خالی خولی بحث آرائی سے سابقہ ہو اور سنجیدہ ماحول میں افہام و تفہیم کی کوئی کوشش نظر نہ آئے وہاں میں خاموش ہو کر علیحدہ ہو جانا زیادہ پسند کروں گا۔ بقول شاعر ع

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
تا بے خبر بمیرد در درد خود پرستی

(۵) اس بحث کو ہماری زبان میں چھیڑنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ آخری سطریں ہیں جو میرے قلم سے نکل رہی ہیں۔ خلش صاحب جو بھی کچھ لکھیں یا نہ لکھیں، مجھ سے کسی مزید اظہار خیال کی توقع نہ کی جائے۔ فضول اور بے مقصد قلم فرسائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

(اختر انصاری)

(یہ بحث اب ختم کی جاتی ہے۔ ادارہ)

روزنامہ پیام کا سنہ اشاعت

ہماری زبان مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں اپنے مضمون "حیدرآباد کے اردو اخبارات" میں طیب انصاری صاحب نے حیدرآباد کے چند دوسرے اہم اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ پیام کا بھی ذکر کیا ہے۔ پیام کی اشاعت کے سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۰ء تک یہ اخبار قاضی صاحب کی ادارت میں حیدرآباد سے نکلتا رہا۔ اس سلسلے میں جہاں تک مجھے علم ہے پیام ۹ مئی ۱۹۲۵ء سے ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء تک قاضی صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طیب صاحب نے زیادہ مستند ذرائع سے معلومات حاصل کی ہوں۔ اور میری اطلاع اتنی صحیح نہ ہو اگر موصوف اس سلسلے میں مزید وضاحت فرما دیں تو میری اور قارئین ہماری زبان کی معلومات میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح قاضی صاحب کی ادارت میں نکلنے والے روزنامے "پیام" کے ایام اشاعت کا بھی صحیح صحیح تعین کیا جا سکے گا۔

(محمد علی کاظمی)

تصحیح

ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شاد احمد صدیقی کے مراسلے کے بارے میں کے مراسلہ نگار کا نام غلطی سے رہ گیا تھا۔ مراسلہ نگار جناب مظہر ہوشیارپوری ہیں۔ (ادارہ)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس کی تیاریاں شروع

پٹنہ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی ایک ہنگامی نشست لالہ زار منزل دریاپور میں زیر صدارت جناب غلام سرور منعقد ہوئی جس میں طے پایا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ اردو کانفرنس پٹنہ میں بتاریخ ۳۰، ۳۱ مارچ منعقد ہوگی۔ یہ اردو کانفرنس انجمن اسلامیہ ہال میں ہوگی۔ اس سلسلہ میں مجلس استقبالیہ کی تشکیل بھی زیر عمل میں آئی جس کے صدر جناب شاہ مشتاق احمد، جنرل سکریٹری جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب اور خازن جناب باسط عظیم آبادی صاحب منتخب ہوئے۔ کانفرنس کے لیے چھ ہزار روپے کا بجٹ بھی تیار کیا گیا ہے اور کانفرنس کی ابتدائی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ (سنگم)

اردو کی بقا کے لیے اجتماعی جدوجہد اور قربانیوں کی ضرورت

حیدرآباد۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ارحال حمایت نگر میں اردو دوستوں کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب کوئی قوم اپنی زبان اور اپنے تہذیبی ورثہ کو قائم رکھنے کا فیصلہ کرے تو کوئی طاقت اس زبان اور تہذیبی ورثہ کو مٹا نہیں سکتی۔ اردو کا تحفظ اردو والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے اجتماعی فیصلہ، جدوجہد اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی زبان سے دست بردار ہو جائے تو وہ عملاً ان چیزوں سے دست بردار ہو جاتی ہے جو اس کو عزیز ہیں۔ اس ملک میں اردو کا مسئلہ اس لیے معرض بحث میں آ گیا ہے کہ سیاست اس میں داخل ہو گئی ہے۔ اگر ہم اس زبان کو باقی رکھنے کا فیصلہ کر لیں تو زمانہ کے نشیب و فراز اس پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ زبان کا مسئلہ ہو یا ہمارا تعلیمی نظام جب تک یہ حکومتوں کے دست نگر ہے انھیں نقصان پہنچا رہا۔ اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے قومی اور اجتماعی فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے رضاکارانہ جدوجہد اور عزم راسخ چاہیے۔ جس قوم میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اپنی زبان کے تحفظ کے لیے موہوم سا خطرہ مول لے تو دنیا کی کوئی طاقت کوئی دستور اور کوئی آئین اس زبان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کی بقا کے لیے آپ کو قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اگر آپ کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب عزیز ہے تو آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ کے بچے اردو پڑھیں گے چاہے مالی اعتبار سے اس کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ مولانا علی میاں نے اس سلسلہ میں عبرانی زبان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہودی قوم نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زبان کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح سے ہمارے ملک کی آبادی کے ایک بڑے طبقہ نے ناگری رسم الخط کے تحفظ کا فیصلہ کیا تھا جس میں وہ کامیاب رہے۔ یہی حال انگریزی کا ہے جس نے اس ملک میں سو برس گزار دیئے۔ سیاسی رہنماؤں اور علمی شخصیتوں نے اسے اپنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو اس زبان سے غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ مولانا علی میاں نے کہا کہ ایک جمہوری ملک میں اردو باشندوں کا مسئلہ کھڑا ہو جائے کیا معنی ہیں۔ جب حب الوطنی کا جذبہ نہ ہو تو زبانوں کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے تعمیری جذبہ نہیں کہا جا سکتا۔ اردو کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا؟ وہ ملک جس نے صدیوں تک محبت اور بھائی چارگی کے گیت گائے ملک کے گوشے گوشے میں انسانیت کا پیام پہونچایا اور جس کے خمیر میں اخوت و ہمدردی ہو وہاں اردو و دیگر زبانوں کا مسئلہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ ایک آزاد ملک میں زبانوں کے تحفظ کا مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے خالص انسانی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اردو کے بارے میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اگر زبان کے ساتھ میدان جنگ، فرقہ وارانہ فسادات بچوں کی یتیمی اور بیوہ پن کے احساسات اور یادیں تازہ ہو جائیں تو یہ ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ ملک کے لیے یہ ایک بد نما داغ ہے زبان ذہنی ملاپ اور انسان میں لطیف جذبات پیدا کرنے اور مذہب کی اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے کے لیے ہے مولانا نے   نے کہا کہ اردو سب کی زبان ہے اور وہ اپنی بیشتر خصوصیات میں منفرد ہے۔ شعراء نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ بات ثابت کر دی کہ اردو میں اس کے زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی سچ پوچھیے تو ہمارے ہندو   اردو کو مسلمانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اگر آبادی کے کسی حصہ کی آزادی سلب کر لی جائے اور اس کو اس کی زبان اور اس کی تہذیب سے محروم کر دیا جائے تو پھر جمہوریت بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اگر ملک کے چھوٹے سے فرقہ کو بھی اظہار خیال کی آزادی نہ ملے اور اسے اپنا تہذیبی ورثہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو یہ انسانیت کے لیے ایک دھبہ ہے علی میاں نے کہا کہ اردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے جسے استحقاق کے طور پر دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں نمایاں جگہ ملی ہے خود یہاں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ نے اردو کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے یہ وہ زبان ہے جس نے کئی زبانوں سے استفادہ کیا۔ عربی کا ذخیرہ اس نے سمویا۔ فارسی کی لطافت اس نے اخذ کی سنسکرت اور انگریزی سے اس نے استفادہ کیا۔ مولانا علی میاں نے اردو کے بہی خواہوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے افکار اور خیالات کو علاقائی زبانوں میں منتقل کریں اردو کے خدمت گزاروں کو اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ قدروں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ صدر جلسہ نواب میر احمد علی خاں نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے ایسے خیالات نہیں ہیں جیسے کہ اتر پردیش میں ہیں حال ہی میں جو کانفرنس یہاں ہوئی تھی اس کے مندوبین نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اس خطہ میں دو زبانیں لازمی طور پر سکھائی جائیں۔ سہ لسانی فارمولا تو اردو دشمنی کی خاطر پیش کیا گیا ہے۔ اس فارمولے میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے البتہ دو لسانی فارمولے میں اس زبان کے لیے مواقع نکل آتے ہیں۔ (ترقی اردو)

حلقہ ادب بھاگلپور کی ماہانہ نشست

حلقہ ادب بھاگلپور کی ماہانہ نشست ۶ مارچ کو دیوان ارشاد زیر صدارت

جناب پروفیسر مظفر اقبال نے بحیثیت صدر حلقۂ ادب جو اجلاس منعقد ہوا جس میں احتساب کمیٹی کی رپورٹ اور ۱۹۹۱ء میں پروگرام مرتب کرنے کی تجویز منظور کی گئی جس کی تکمیل کے لیے حسب ذیل احباب پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جناب پروفیسر مظفر اقبال (صدر حلقۂ ادب)، جناب غیاث احمد اثر (نائب صدر)، جناب شاغل قادری (نائب صدر)، جناب پروفیسر لطف الرحمن (نائب صدر)، جناب محی الدین مخفی (معتمد عمومی)، جناب نواب ارشاد حسین دیا (نائب صدر)، جناب کریم اسدی (خازن)، جناب رفیق الزماں، جناب حسن رہبر، جناب شبیر احمد صابری (نائبین)، جناب پروفیسر ڈاکٹر سید احمد حسن، ڈاکٹر محمد یونس (اراکین)، جناب شاہ اشرف عالم، جناب نسیم آروی، جناب نقی شاعر، جناب ارشاد ہی، جناب منیر مجید، جناب نیاز احمد جعفری (اراکین حلقہ)

آخر میں حسب ذیل حضرات نے اپنی تخلیقات پیش کیں جنھیں شرکا نے پسند کیا۔

جناب پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر غیاث اثر، نقی شاعر، نسیم آروی، اکرام انجم، رفیق الزماں، روشن آرا تنویر، حسن رہبر، کریم اسدی، پروفیسر لطف الرحمن
یہ نشست رات گئے ابلیہ برخاست ہوئی۔

(رفیق الزماں نائب معتمد)

لسانی اقلیت کے لیے یونیورسٹی سطح تک مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے

حیدرآباد، کمیونسٹ لیڈر جناب مخدوم محی الدین نے قانون ساز کونسل میں ریاستی بجٹ پر عام مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے سہ لسانی فارمولا پر جو دونوں ایوانوں میں منظور شدہ سرکاری زبان قرارداد میں شامل ہے تنقید کی۔ جناب مخدوم محی الدین نے کہا کہ سہ لسانی فارمولا اقلیتوں کے بچوں پر مزید بوجھ ہوگا جنھیں انگریزی، تلگو اور ہندی کے علاوہ ان کی مادری زبان اردو، تامل، کنڑی یا مرہٹی سیکھنا پڑے گا۔ انھوں نے حکومت سے طلبہ کو تمام جماعتوں میں اور یونیورسٹی سطح پر اعلیٰ تعلیم بھی مادری زبان میں دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب مخدوم نے کہا کہ ہندی اور غیر ہندی ریاستوں کے درمیان تلخیاں دور کرنے اور بچوں کو غیر ضروری بوجھ سے محفوظ رکھنے پہلی سے دسویں جماعت تک مادری زبان علاقائی زبان میں تعلیم دینے نیز بچوں سے دسویں جماعت تک لازمی زبان، انگریزی، ہندی، پڑھانے اور آٹھویں جماعت تک ہندی یا کسی اور زبان کو بطور اختیاری زبان پڑھانے کی ضرورت ہے مرکز کی رابطہ زبان ہندی ہو جانی چاہیے اور ہندی کے اس پوزیشن میں آنے تک انگریزی کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ (ترقی اردو)

حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد، مزاح نگاروں کا تیسرا سالانہ اجتماع ۲۴ر ۲۵ر ۲۶ر فروری کو منعقد ہوا جس میں بیرون آندھرا پردیش سے آئے ہوئے آئی ایس جوہر، رضا نقوی واہی، سلیمان خطیب اور ہلال سیوہاروی نے شرکت کی۔ ۲۴ر فروری کو وزیر آبپاشی جناب سلیم صدا ریڈی نے فائن آرٹس اکاڈمی کی مطبوعات گھوڑ دوڑ کے کانٹے (علی صاحب میاں) اور نشتر و مرہم (رضا نقوی واہی) کی رسم اجرا انجام دی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر مسعود حسین خاں نے کی اور شہریار کا درس جی نے علی صاحب میاں اور احسن علی مرزا نے رضا نقوی واہی کی شاعری پر مضامین پڑھے۔ اعلم آزاد نے ڈاکٹر اختر اورینوی کا ایک مضمون سنایا جس میں واہی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے صدارتی تقریر میں کہا کہ دکنی زبان میں اردو ادب کا قدیم سرمایہ موجود ہے۔ اردو کی تمام اصناف کا گہوارہ دکن ہے۔ انھوں نے علی صاحب میاں کے بارے میں کہا کہ وہ ٹھیٹ دکنی محاورے اور باتوں باتوں میں چبھتی بات کہہ جاتے ہیں۔ واہی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ معیاری اردو کے شاعر ہیں اور ان کے ہاں کلاسیکی رنگ ملتا ہے۔ ۲۵ر فروری کو ادبی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مشہور فلمی اداکار اور مزاح نگار آئی۔ ایس۔ جوہر نے کی اور مجتبیٰ حسین (ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے)، ڈاکٹروں کے ایجادات، حید کھنہ (گھر داماد)، رشید قریشی (گھوڑا جوڑا) اور ڈاکٹر حبیب الشان (ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے بیماروں کے)، مصطفیٰ علی بیگ (مذکورہ باہی بجلا) نے اپنے مضامین سنائے۔ آئی۔ ایس۔ جوہر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ طنز و مزاح کا مقصد یہ ہے کہ اپنے عہد کی بیہودگیوں، سماجی، معاشی اور معاشرتی برائیوں کا خوش سلیقگی کے ساتھ مذاق اڑایا جائے۔ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو صداقت، اصلاح اور تعمیری ادب کا نام دیا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس صنف سے تعلق رکھنے والوں کی سماج میں اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

لطیفہ گوئی میں کل ہند شہرت رکھنے والے مثال صاحب نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ انھوں نے افتتاحی اجلاس میں بیسیوں لطیفے سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا تھا۔

ادبی اجلاس ڈاکٹر رشید موسوی کے شکریہ پر ختم ہوا۔ مزاح نگاروں کے تیسرے سالانہ اجلاس کے آخری دن نمائش میدان میں مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جس میں دس ہزار سے زائد شیدائیان اردو نے شرکت کی۔ مشاعرہ کی صدارت آغا حیدر حسن مرزا نے کی اور اکیس شاعروں نے اپنا کلام سنایا

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر ادیب ترشب نے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپا کر اور جنرل سیکریٹری دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا